اُردو (لازمی)

برائے

انٹرمیڈیٹ سال دوم

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شروع اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

اُردو (لازمی)

بارھویں جماعت کے لئے

پبلشرز

نیو کالج پبلی کیشنز، کوئٹہ

برائے

بلوچستان ٹیکسٹ بک بورڈ کوئٹہ

فہرست

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
	حصہ نثر		
۱	بنتِ بہادر شاہ	خواجہ حسن نظامی	۶
۲	ریل کا سفر	ڈاکٹر وزیر آغا	۱۵
۳	زمانہ قدیم میں ہندوستانیوں کے طور طریقے	مولانا محمد حسین آزاد	۲۳
۴	مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم	مولانا شبلی نعمانی	۳۰
۵	اُردو لٹریچر کے عناصر خمسہ	مہدی افادی	۳۸
۶	کہنے کی باتیں	مولانا صلاح الدین احمد	۴۶
	افسانے		
۱	سفارش	احمد ندیم قاسمی	۵۲
۲	جی آیا صاحب	سعادت حسن منٹو	۶۰
۳	کتبہ	غلام عباس	۷۰
۴	چور	اشفاق احمد	۸۱
۵	شریف آدمی	شوکت صدیقی	۸۹
۶	نیا گوتم	الطاف فاطمہ	۱۰۵
	طنز و مزاح		
۱	سویرے جو کل آنکھ میری کھلی	پروفیسر پطرس بخاری	۱۱۳
۲	سنہ	مشتاق احمد یوسفی	۱۲۳
	شخصیت نگاری		
۱	آغا حشر	چراغ حسن حسرت	۱۳۱
۲	ایک وصیت کی تعمیل	فرحت اللہ بیگ	۱۴۲

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۳	تیسری قسم کا بچہ	فارغ بخاری	۱۵۳

غزلیات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱	؎ کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد	علامہ محمد اقبال	۱۵۹
۲	؎ وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے . . .	فیض احمد فیض	۱۶۳
۳	؎ دل میں اِک لہر سی اُٹھی ہے ابھی	ناصر کاظمی	۱۶۸
۴	؎ تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدر کے ہوگئے	احمد فراز	۱۷۳
۵	؎ کوئی امکاں نہیں تجھ تک رسائی کا	احمد ندیم قاسمی	۱۷۶
۶	؎ یہ سوچ کر کہ تیری جبیں پہ نہ بل پڑے	شہزاد احمد	۱۸۰
۷	؎ بکھری ہوئی فلک پہ شام ہے کوئی	ظفر اقبال	۱۸۳
۸	؎ آ کے پتھر تو میرے صحن میں دو چار گرے	شکیب جلالی	۱۸۸

حصہ نظم

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
۱	فاطمہ بنت عبداللہ	علامہ محمد اقبال	۱۹۱
۲	او دیس سے آنے والے بتا!	اختر شیرانی	۱۹۶
۳	وحدتِ انسانی	جوش ملیح آبادی	۲۰۰
۴	دکھ کی کروٹ	میرا جی	۲۰۵
۵	طلوعِ فرض	مجید امجد	۲۱۰
۶	پہلی کرن	ن۔م۔راشد	۲۱۵
۷	زندگی	منیر نیازی	۲۲۰
۸	دھرتی کی آواز	ڈاکٹر وزیر آغا	۲۲۳
۹	فرہنگ		۲۲۷

سب کو پریشانیوں سے نجات دے"۔

اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا، زینب کو پیار کیا اور میرے خاوند مرزا ضیاء الدین کو کچھ جواہرات عنایت کر کے نور محل صاحبہ کو ہمراہ کر دیا جو حضور کی بیگم تھیں۔

پچھلی رات کو ہمارا قافلہ قلعے سے نکلا۔ جس میں دو مرد اور تین عورتیں تھیں۔ مردوں میں ایک میرے خاوند مرزا ضیاالدین اور دوسرے مرزا عمر سلطان بادشاہ کے بہنوئی تھے۔ عورتوں میں ایک میں، دوسری نواب نور محل، تیسری حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ جس وقت ہم لوگ رتھ میں سوار ہونے لگے۔ صبح صادق کا وقت تھا۔ تارے سب چھپ گئے تھے مگر فجر کا تارا جھلملا رہا تھا۔ ہم نے اپنے بھرے پُرے گھر پر اور سلطانی محلوں پر آخری نظر ڈالی تو دل بھر آیا اور آنسو اُمنڈ نے لگے۔ نواب نور محل کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور پلکیں ان کے بوجھ سے کانپ رہی تھیں اور صبح کے ستارے کا جھلملانا نور محل کی آنکھوں میں نظر آتا تھا۔

آخر لال قلعے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو کر کورالی گاؤں میں پہنچے اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا۔ باجرے کی روٹی اور چھاچھ کھانے کو میسر آئی۔ اس وقت بھوک میں یہ چیزیں بریانی متنجن سے زیادہ مزے دار معلوم ہوئیں۔ ایک دن تو امن سے بسر ہوا مگر دوسرے دن گردونواح کے جاٹ گوجر جمع ہو کر لوٹنے کو چڑھ آئے۔ سیکڑوں عورتیں بھی ان کے ساتھ تھیں جو چڑیلوں کی طرح ہم لوگوں کو چمٹ گئیں۔ تمام زیور اور کپڑے ان لوگوں نے اتار لیے۔ جس وقت یہ سڑی سی عورتیں اپنے موٹے موٹے میلے میلے ہاتھوں سے ہمارے گلے کو نوچتی تھیں تو ان کے لہنگوں سے ایسی بو آتی تھی کہ دم گھٹنے لگتا تھا۔

اس لوٹ کے بعد ہمارے پاس اتنا بھی باقی نہ رہا جو ایک وقت کی روٹی کو کافی ہو سکتا ہے۔ حیران تھے کہ دیکھیے اب اور کیا پیش آئے گا؟ زینب پیاس کے مارے رو رہی تھی۔ سامنے سے ایک زمیندار نکلا۔ میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی۔ "بھائی تھوڑا سا پانی اس بچی کو لا دے"۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا "آج سے تو میری بہن اور میں تیرا بھائی"۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ اس کا نام بستی تھا۔ اس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں۔ ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی، شاہی حکیم رہتے ہیں، جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں، وہاں لے چل، بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا، مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں۔ صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ نہیں کرنا چاہتا۔

وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا۔ ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہو گی، اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی۔ وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے، وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے۔ شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نبھایا اور ہمارا

ساتھ نہ چھوڑا، ناچار اجاڑے سے روانہ ہو کر حیدر آباد کا رخ کیا۔ عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے۔ تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اُتارا۔ ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی۔

میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیے۔ ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے۔ سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی۔ ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے۔ ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے پر ہائے! کیسی مصیبت تھی کہ ہم کو بھاگنا بھی نہیں آتا تھا۔ گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے۔ سر کی چادریں وہیں رہ گئیں۔ برہنہ سر، حواس باختہ، ہزار دِقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خونم خون ہو گئے۔ پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں، زینب پر غشی کا عالم تھا۔ مرد ہم کو سنبھالتے تھے، مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا۔

نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہو گئیں۔ میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں؟ کہیں سہارا نظر نہیں آتا۔ قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہو گئی لیکن فقیروں کو چین و اطمینان ہوتا ہے، یہاں وہ بھی نصیب نہیں۔

فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی۔ بستی، ندی سے پانی لایا ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا۔ نور محل رونے لگیں اور بولیں۔ ابھی خواب میں تمھارے بابا حضرت ظلِ سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ "آج ہم غریبوں کے لیے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرشِ مخمل سے بڑھ کر ہے۔ نور محل! گھبرانا نہیں ہمت سے کام لینا۔ تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں۔ ذرا میری کلثوم کو دکھا دو۔ جیل خانے جانے سے پہلے اُسے دیکھوں گا"۔

بادشاہ کی یہ باتیں سن کر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی۔ "کلثوم! کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا"۔ مرزا عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ خواب و خیال ہے۔ بادشاہ لوگ، بادشاہوں کے ساتھ بدسلوکیاں نہیں کیا کرتے۔ تم گھبراؤ نہیں وہ اچھے حال میں ہوں گے۔ حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں۔ "یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے۔ خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں (سکے کی طرف اشارہ ہے جس میں بادشاہ کے سر کی مورت ہوتی ہے) بوا نور محل! تم نے تو طوق و زنجیر پہنے دیکھا ہے میں کہتی ہوں کہ بنیئے بقالوں سے تو اس سے بھی زیادہ بدسلوکی دور نہیں۔ مگر میرے شوہر مرزا ضیاء الدین نے تسکین دلاسے کی باتیں کر کے سب کو مطمئن کر دیا۔ اتنے میں بستی، ناؤ میں گاڑی کو اس پار

یاد نے بے چین کیا اور روانہ ہو کر دہلی آ گئے۔ یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھا کر دس روپیہ ماہوار پینشن مقرر کر دی۔ اس پینشن کی رقم کو سن کر اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لے کر دس روپے معاوضہ دیتے ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو اللہ کا ہے۔ کسی کے باوا کا نہیں۔ وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

(غدر دہلی کے افسانے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بچوں کو خود سے کیوں الگ کیا؟

ب) کورالی گاؤں میں شاہی قافلے کو کھانے میں کیا میسر آیا؟

ج) لال قلعہ سے روانگی کے بعد بنت بہادر شاہ کہاں گئیں؟

د) کس نے کلثوم زمانی بیگم سے کہا کہ آج سے تو میری بہن اور میں تمہارا بھائی۔"

ہ) کلثوم کا خاوند کس چیز کا ماہر تھا؟

و) بنت بہادر شاہ کا مکہ معظمہ میں بڑے سلطان سے کون مراد تھا؟

ز) مرزا ضیاء الدین اور مرزا عمر سلطان کس کی فوج میں شامل ہونا چاہتے تھے؟

ح) مکہ معظمہ میں شہزادی نے کس کے ہاں قیام کیا؟

۲۔ سبق کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) بنتِ بہادر شاہ کا نام تھا۔

i) زینب زمانی بیگم
ii) قمر زمانی بیگم
iii) کلثوم زمانی بیگم
iv) نواب نور محل

ب) مکہ معظمہ میں بنتِ بہادر شاہ نے قیام کیا۔

i) تین برس
ii) سات برس
iii) نو برس
iv) گیارہ برس

ج) انگریز سرکار نے ماہوار پنشن مقرر کی۔

(i) دس روپیہ (ii) بارہ روپیہ

(iii) پندرہ روپیہ (iv) اٹھارہ روپیہ

د) ہجرت کے وقت زینب کی عمر تھی۔

(i) ساڑھے تین برس (ii) ڈھائی برس

(iii) تین برس (iv) دس برس

ہ) اُجاڑہ ضلع میں واقع ہے۔

(i) میرٹھ (ii) دہلی

(iii) حیدر آباد (iv) کلکتہ

و) بادشاہ کو خواب میں دیکھا۔

(i) بنت بہادر شاہ نے (ii) نور محل نے

(iii) مرزا ضیاء الدین نے (iv) مرزا عمر سلطان نے

۳۔ متن کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) بنت بہادر شاہ کے قافلے میں تین مرد اور تین عورتیں تھیں۔

ب) میر فیض علی نے بنت بہادر شاہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔

ج) بنت بہادر شاہ ظفر نے بغداد اور نجف میں ایک ایک سال قیام کیا۔

د) بنت بہادر شاہ اپنے والد کو حضرت ظلِ سبحانی کہتی تھیں۔

ہ) قافلہ لال قلعے سے شام کے وقت روانہ ہوا۔

۴) متن کے مطابق خالی جگہ میں درست لفظ تحریر کریں۔

الف) نور محل بادشاہ کی .... تھیں۔

ب) کلثوم بیگم کے خاوند کا نام .... تھا۔

ج) مرزا عمر سلطان بادشاہ .... تھے۔

د) بادشاہ کے سمدھن کا نام .... تھا۔

ہ) یہ .... کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا۔

ریل کا سفر

(ڈاکٹر وزیر آغا)

مقاصدِ تدریس

۱۔ آپ بیتی لکھنے کی مشق کرانا۔
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے طرزِ نگارش سے واقفیت دلانا۔
۳۔ ادب پارے کے مرکزی خیال اور خلاصہ لکھنے سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ کو سماجی یک جہتی اور یگانگت کی اہمیت بتانا۔

خاص الفاظ و تراکیب

ہوائی اُڑانا ۔ بھانت بھانت ۔ بادی النظر ۔ اقامت پذیر ۔ استہزائیہ ۔ مریل ۔ نووارد ۔ گڈمڈ ۔ یکہ وتنہا ۔ ریوڑ ۔ بوالعجمیوں

ریل میں سفر کرنے کے یوں تو بہت سے فائدے ہیں۔لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس سفر کی ترغیب دلانے والے اکثر وبیش تر جسمانی آسائش کے حصول پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک ایسے شخص کی تصویر پیش کرتے ہیں جو پوری سیٹ پر دراز، سر کے نیچے تکیہ اور پاؤں کے نیچے تہہ کیا ہوا بستر رکھے ایک شانِ دلربائی کے ساتھ کتاب پڑھنے میں منہمک ہوتا ہے۔آخر میں یہ لوگ اُس شخص کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں آسائش کا اس سے زیادہ لطیف اور پاکیزہ تصور ناممکن ہے۔

بادی النظر میں تو مجھے اس شخص کا قول قابلِ قبول ہی نظر آتا ہے۔لیکن جب میں اپنے پچھلے تجربات کی روشنی میں دیکھتا ہوں تو شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیوں کہ مجھے یاد آتا ہے کہ ریل میں سفر کرتے وقت اول تو ساری سیٹ پر دراز ہونے کی سعادت ہی مشکل سے نصیب ہوتی ہے۔اور اگر نصیب ہو بھی جائے تو چلتی گاڑی میں کتاب پڑھنا اس سے مشکل تر مسئلہ بن جاتا ہے۔ میں بہ مشکل اپنی انگلی کی مدد سے آدھی سطر پڑھنے میں کامیابی حاصل کرتا ہوں کہ ریل کے ایک ہی ہچکولے سے میری انگلی کسی اور سطر پر جا ٹکتی ہے۔ کچھ وقت اصل سطر کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے۔اور جب یہ خرابی بسیار مجھے اس سطر تک رسائی حاصل ہوتی ہے تو ریل کا تازہ جھٹکا انگلی کو پھر کسی دوسری سطر تک پہنچا دیتا ہے۔ کتاب تو درکنار مجھے کبھی چلتی ریل میں پانی کا گلاس پینے میں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی۔ ویسے کوشش میں نے کئی بار کی ہے اور دوسرے مسافروں کی مسکراتی ہوئی آنکھوں کے باوجود کنگ بروس اور کڑی کی روایات کو برقرار رکھتا آیا ہوں۔لیکن بدقسمتی سے گلاس اور ہونٹ میں کبھی ملاپ نہیں ہوسکا۔ تصادم البتہ کئی بار ہوا ہے۔

جسمانی آسائش سے قطع نظر ریل کے سفر کے بعض دوسرے پہلو یقیناً بڑے جاذبِ نظر اور خیال انگیز ہیں اور میں دراصل انہی پہلوؤں کے پیش نظر ریل کے سفر کی پرزور سفارش کرنے لگا ہوں۔ ان میں سے ایک پہلو تو یہ ہے کہ ریل کا سفر

انسانی فطرت کے نفسیاتی مطالعہ کے بعض نہایت قیمتی مواقع فراہم کرتا ہے۔ جب تک ہم اپنے گھر، محلّہ، شہر یا گاؤں میں اقامت پذیر رہتے ہیں ہماری بہت سی جبلتوں پر رسم و رواج اور روایت و اخلاق کے بھاری پردے پڑے رہتے ہیں۔ لیکن جب کبھی ہم اپنے اس زندان سے نکل کر ریل میں سوار ہوجاتے ہیں اور گھر، محلّہ، شہر یا گاؤں کے ساتھ ہمارے روابط کچھ مدّت کے لیے ٹوٹ جاتے ہیں تو قدرتی طور پر ہمارے فطری اوصاف یا برائیاں اُبھر کر نمایاں ہوجاتی ہیں۔ چناں چہ میں نے اکثر اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ ریل کے سفر کے دوران میں یا تو لوگ حد سے زیادہ ملنسار اور بامروت نظر آتے ہیں اور یا حد سے زیادہ چڑ چڑے اور بدمزاج دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح فطری طور پر خاموش لوگ ریل کے ڈبے میں اس درجہ خاموش ہوجاتے ہیں کہ ان پر رحم آنے لگتا ہے۔ اور فطرتاً باتونی لوگ کچھ اتنے باتونی ہوجاتے ہیں کہ جان چھڑانا مشکل ہوجاتا ہے۔ مجھے یوں تو ریل کے سفر میں انسانی فطرت کے اس دلچسپ مطالعہ کے بہت سے مواقع ملے ہیں۔ لیکن ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پچھلے موسمِ سرما کی بات ہے۔ رات کا وقت تھا اور میں لاہور جانے کے لیے ایک غیر معروف اسٹیشن سے انٹر کلاس کے ڈبے میں سوار ہوا تھا۔ اتفاق سے ڈبے میں ایک سیٹ خالی تھی اور میں جلدی سے بستر بچھا اس پر دراز ہوگیا اور دراز ہوتے ہی سو گیا۔ نہ جانے میں کتنی مدّت سویا رہا کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے کوئی منوں بھاری چیز میری ٹانگوں پر آگری ہے۔ میں نے جلدی سے اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں اور منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو ایک صاحب نظر آئے جو میری سیٹ کے آخری کونے میں بڑے اطمینان سے براجمان ہوچکے تھے۔ خیر میں دوبارہ سو گیا لیکن چند ہی لمحوں کے بعد محسوس ہوا جیسے کوئی چیز مجھے آہستہ آہستہ اوپر کو دھکیل رہی ہے۔ اس بار میں نے منہ سے کمبل ہٹا کر دیکھا تو حیران رہ گیا کہ وہی صاحب اب آدھی سیٹ پر قبضہ کرچکے تھے اور بتدریج اپنی مملکت کی حدود کو بڑھا رہے تھے۔ اب میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ میں کچھ اور سمٹ جاتا۔ چناں چہ میں کچھ اور سمٹ گیا۔ وہ کچھ اور پھیل گئے۔ میں اٹھ بیٹھا۔ وہ لیٹ گئے اور بڑی بے تکلفی سے خراٹے لینے لگے۔ اب اتفاق دیکھیے کہ میرے سامنے والی سیٹ پر دوسرے مسافروں کے علاوہ ایک انتہائی مریل قسم کے صاحب تشریف فرما تھے اور قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے یہ سارا ڈراما انتہائی غور سے ملاحظہ فرمایا ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اُن کے چہرے سے استہزائیہ تبسم کی بجائے خشونت مترشح تھی۔ جیسے وہ میرے بزدلانہ فعل کو انتہائی حقارت سے دیکھ رہے ہوں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُس وقت مجھے اپنی نالائقی پر اس قدر شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے اپنی گردن جھکا لی اور اُن سے آنکھیں چار کرتے ہوئے ڈرنے لگا۔ لیکن شاید کارکنانِ قضا و قدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ کہ اگلے ہی اسٹیشن پر جو گاڑی رُکی تو ایک انتہائی بھاری بھرکم صاحب ہانپتے کانپتے گاڑی میں سوار ہوئے اور مسافروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈال کر ان مریل صاحب کے پہلو میں تشریف فرما ہوگئے۔ ان صاحب نے انتہائی حقارت اور غصے سے نووارد کی اس حرکت کو دیکھا اور کچھ دیر تک ماتھے پر تیوری ڈالے انہیں بڑی سختی سے گھورتے رہے۔ اس کارروائی کا کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انہوں نے اپنا شانہ نووارد کے پہلو سے لگا دیا اور پورے جوش اور ولولے کے ساتھ اُنہیں سیٹ پر

سے دھکیلنے کی سعی کا آغاز کردیا۔ خاصی دیر تک وہ بڑے زور وشور سے یہ کام سرانجام دیتے رہے۔ لیکن وہ بھاری بھرکم صاحب کچھ کھانے میں اس درجہ منہمک تھے کہ انہیں اس زورآزمائی کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہرحال کچھ مدت تک تو حملہ یک طرفہ تھا اور پھر اچانک ان بھاری بھرکم صاحب کو اپنے ساتھی مسافر کی حرکت کا علم ہوگیا۔ وہ مسکرائے اور ذرا سا پہلو بدل ڈالا۔ لیکن ان کی اس انتہائی بے ضرر حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ مریل صاحب سیٹ سے دوگز پرے اُچھل کر دوسرے مسافروں پر جاگرے۔ تاہم انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ اور دوبارہ اپنی کارروائی کا آغاز کردیا۔ باقی راستہ یہ ڈراما برابر جاری رہا۔ یہ زور لگاتے رہے، وہ مسکراتے اور پہلو بدلتے رہے اور میں جاگتا رہا۔

لیکن فطرت انسانی کی بوالعجمیوں کا یہ مطالعہ ہی مجھے ریل کے سفر کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ اُن پراسرار مناظر میں کھو جانے کے لیے بھی ریل میں سوار ہوتا ہوں، جو ریل کی کھڑکی سے باہر حدنظر تک پھیلے ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ریل کا سفر بہ یک وقت مجھے انبوہ اور تنہائی کا احساس دلاتا ہے یعنی جب میں اپنے ساتھی مسافروں کو دیکھتا ہوں جنہیں تقدیر نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اٹھا کر چند لحظوں کے لیے ایک جگہ گڈمڈ کردیا ہے اور جو بھانت بھانت کی بولیوں انوکھے متضاد خیالات اور بدمزاجی اور مروت کے مظاہروں سے چہکتی بولتی زندگی کا ایک انتہائی سچا نمونہ پیش کرتے ہیں، تو میں خود بھی اس کلبلاتی ہوئی مخلوق کا ایک جزو بن جاتا ہوں۔ اور ایسی سنجیدگی سے اپنی آرا کو دلائل سے مضبوط کرتا ہوں گویا فریق مخالف کا اقرار ہی میری زندگی کا اہم ترین مشن ہے لیکن میں جب دوسرے ہی لمحے ریل کی کھڑکی سے ایک نظر باہر کی دُنیا پر ڈالتا ہوں تو نہ صرف یہ کہ اپنے ساتھی مسافروں کی موجودگی سے بے نیاز ہوجاتا ہوں، بلکہ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اس وسیع وعریض کائنات میں یکہ وتنہا کھڑا ہوں۔ ایسے میں میرے ساتھی مسافروں کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکراتی تو ہیں لیکن اس طور گویا کسی گہرے کنویں سے آرہی ہوں۔ اور میری تمام تر توجہ اُس ہر آن بدلتے ہوئے منظر پر مرکوز ہوجاتی ہے جو مجھے تیزی سے حرکت کرتا نظر آتا ہے۔ میں اس منظر کے اجزائے ترکیبی پر غور کرتا ہوں اور حیران ہوتا ہوں کہ بظاہر تو محض چند نہروں، کھیتوں اور پہاڑیوں سے اس کی تشکیل ہوئی ہے۔ لیکن اس کا مجموعی تاثر کس درجہ حسین و دلفریب ہے اور تب ایمرسن کی طرح مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ اس منظر کا ہر جزو کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔ یعنی نہر سرکار کی ہے، کھیت زید کا ہے، مکان بکر کا ہے۔ لیکن یہ منظر۔ سارے کا سارا منظر میرا اور صرف میرا ہے۔ نیلے آسمان پر قرمزی ابر پارے بکھرے ہوئے ہیں اور میرے ساتھ ساتھ دوڑتے جارہے ہیں۔ حدنظر تک کھیتوں اور پہاڑیوں کا دل فریب سلسلہ ہے جو بھنور کی طرح چکر لگا رہا ہے۔ شام ہونے کو آئی ہے۔ گاڑی ایک چھوٹے سے گاؤں کے قریب سے گزر رہی ہے۔ گاؤں میں زندگی کی رفتار کس قدر سُست ہے۔ ایک جوان لڑکی پانی کا گھڑا اٹھائے ہوئے ہولے ہولے رہٹ کی طرف آرہی ہے۔ کوئی گڈریا دھیرے دھیرے اپنے ریوڑ کو لیے گاؤں میں داخل ہورہا ہے۔ گاؤں کے تنور سے گاڑھا گاڑھا سُست رو دھواں اُٹھ رہا ہے اور گاڑی فراٹے بھرتی ہر شے کو پیچھے چھوڑتی، کسی نامعلوم منزل کی جانب

اُڑی چلی جارہی ہے۔ آپ ہی کہیے کوئی ایسے منظر کو کیسے فراموش کرسکتا ہے؟ یہ منظر تو دل میں رکھ لینے کے قابل ہے اور میں ایسا ہی کرتا ہوں۔

لیکن ریل کا سفر محض اڑتے ہوئے مناظر سے حظ اٹھانے تک ہی محدود نہیں اس کا ایک دلچسپ پہلو اُن اسٹیشنوں کی زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی ہے جو حرکت اور تموج کے سمندر میں ننھے ننھے خاموش جزیروں کی طرح نظر آتے ہیں اور جن کے کناروں پر ریل گاڑی لحظہ بھر کے لیے رُکتی ہے۔ لیکن شاید میں نے ان جزیروں کو خاموش قرار دینے میں غلطی کی ہے۔ کیوں کہ اُڑتے ہوئے مناظر کی خاموشی کے مقابلے میں یہاں زندگی کی گہما گہمی نسبتاً زیادہ ہوتی ہے بڑے اسٹیشنوں کی بات نہیں کرتا۔ جہاں ریڑھی والے آپ کی کھڑکی کے عین نیچے آکر اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ ہانک لگاتے ہیں۔ تاکہ آپ پر اشیا خریدنے کے لیے نفسیاتی دباؤ ڈال سکیں۔ اور جہاں انجنوں کی شفٹنگ، قلیوں کی بھاگ دوڑ اور بدحواس مسافروں کی گھبراہٹ پر آپ کو میدانِ کارزار کا گمان ہوتا ہے۔ بلکہ اُن ننھے ننھے یتیم اسٹیشنوں کی بات کرتا ہوں جہاں اسٹیشن ماسٹر صاحب وردی کے کوٹ کے نیچے لٹھے کی شلوار پہنے ہاتھ میں کاغذات کا پلندہ لیے، گارڈ کے ڈبے کی طرف بھاگتے نظر آتے ہیں۔ اور کانٹے والا با آوازِ بلند انجن ڈرائیور سے چلم کے لیے آگ کا مطالبہ کررہا ہوتا ہے اور جہاں آپ کو اچانک محسوس ہوتا ہے گویا ایک طویل تنہائی کے بعد آپ نے زندہ وشاداب، تڑپتی اور مسکراتی ہوئی زندگی کا پرتو دیکھا ہے۔ اسٹیشن پر ریل کے ٹھہرنے کا ایک رومانی پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ آپ کی گاڑی آہستہ ہوتی ہوئی پلیٹ فارم پر آکر رک جاتی ہے۔ آپ نظریں اٹھاتے ہیں اور آپ کو پلیٹ فارم کی دوسری طرف محض دو چار ہاتھ کے فاصلے پر کوئی اور مسافر گاڑی کھڑی نظر آتی ہے۔ اب اتفاق دیکھیے کہ آپ کا ڈبہ جہاں رُکتا ہے، اس کے عین سامنے کے ڈبے میں کھڑکی سے لگی کوئی اُداس سی حسینہ بیٹھی ہوتی ہے جو آپ کی گاڑی کو رُکتے دیکھ کر ہولے سے مسکرا دیتی ہے۔ آپ جلدی سے اٹھتے ہیں بالوں کو سنوارتے ہیں، ٹائی کی گرہ درست کرتے ہیں اور جلدی سے واپس اپنی سیٹ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی دیکھیے کہ آپ کے بیٹھتے ہی انجن کی سیٹی کی تیز آواز آپ کے کانوں سے ٹکراتی ہے اور محبوبہ دلنواز کی گاڑی آپ کی تمناؤں اور آشاؤں کو کچلتی، ہولے ہولے پلیٹ فارم پر سے کوچ کر جاتی ہے۔ اب آپ کے سامنے ایک خلا ہے، حسرتوں اور محرومیوں کے خلا جس میں ایک بُھدّا سا انجن چند مال گاڑیوں کا تعاقب کررہا ہے۔ آپ اس منظر سے نظریں ہٹا لیتے ہیں۔ لمبا سا سانس لیتے ہیں اور اپنی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کردیتے ہیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ریل کے سفر کے ایسے کئی اور پہلو بھی ہیں، جن کے حق میں بہت کچھ کہا سنا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ ریل کا سفر جسمانی آسائش کا موجب بھی ہے، یقین مانیے یہ ہوائی ضرور کسی دشمن نے اُڑائی ہے۔

(خیال پارے)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

الف) دورانِ سفر کون سی چیز مصنف کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف دھکیل رہی تھی؟

ب) مصنف ریل کے سفر کی آسائش کو قبول کرنے کے لیے کیوں تیار نہیں ہوتا؟

ج) مصنف ریل کے سفر کے دوران مطالعہ کیوں نہیں کر پاتا تھا؟

د) ریل کے سفر کے دوران لوگوں کا مزاج کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے؟

ہ) دورانِ سفر مصنف کو کس بات پر شرمندگی محسوس ہوئی؟

و) کون سی بات مصنف کو ریل کے سفر سے روکتی رہی؟

ز) اسٹیشن پر ریل ٹھہرنے کا رومانی پہلو کون سا ہے؟

۲۔ متن کے مطابق دُرست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) ریل کے سفر کے دوران میں مصنف کے لیے کتاب کا پڑھنا تھا۔

i) آسان ii) مشکل

iii) کٹھن iv) ناممکن

ب) ریلوے اسٹیشن پر ریل ٹھہرنے کا پہلو ہے۔

i) نفسیاتی ii) سماجی

iii) اقتصادی iv) رومانی

ج) مصنف کو ریل کے سفر سے تجربات حاصل ہوئے۔

i) تلخ ii) خوشگوار

iii) ملے جُلے iv) حیرت ناک

د) ریلوے اسٹیشن پر اشیاء فروخت کرنے والے مسافروں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

i) نفسیاتی ii) جسمانی

iii) اخلاقی　　iv) دھونس دھمکی

ج) مصنف ریل کے سفر کے آسائش سے مطمئن نہیں۔

i) اقتصادی طور پر　　ii) جسمانی طور پر

iii) نفسیاتی طور پر　　iv) رومانوی طور پر

۳۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق و سباق بھی لکھیں۔

''لیکن فطرت انسانی کی بوالعجبیوں کا یہ مطالعہ.................. کلبلاتی ہوئی مخلوق کا جزو بن جاتا ہوں''۔

۴۔ متن کے مطابق دُرست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) مصنف نے ڈبے میں سوار ہوتے ہی مطالعہ شروع کیا۔

ب) مصنف دورانِ سفر رش کی وجہ سے جاگ گیا۔

ج) گاؤں میں زندگی کی رفتار سُست ہوتی ہے۔

د) ایک دفعہ مصنف نے موسم سرما میں ریل کا سفر کیا تھا۔

ہ) سبق ''ریل کا سفر'' صنفِ ادب کے لحاظ سے افسانہ ہے۔

۵۔ متن کے مطابق خالی جگہیں دُرست الفاظ سے پُر کریں۔

الف) مضمون ''ریل کا سفر'' ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب .... سے لیا گیا ہے۔

ب) بقول مصنف ریل کا سفر انسانی فطرت کے..................مطالعہ کے بعض نہایت قیمتی مواقع فراہم کرتا ہے۔

ج) دورانِ سفر ریل ہمارے..................یا..................اُبھر کر نمایاں ہوجاتی ہیں۔

د) مصنف بہت سے..................مناظر کے لیے ریل کا سفر اختیار کرتا تھا۔

ہ) مصنف کو..................کی طرح احساس ہوتا ہے کہ دوران سفر ہر منظر ہر چیز کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔

۶۔ سبق ''ریل کا سفر'' میں بیان کردہ کوئی ایک واقعہ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

۷۔ سبق ''ریل کا سفر'' کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ سبق ''ریل کا سفر'' کا مرکزی خیال بیان کریں۔

۹۔ سفرِ ریل کس طرح سماجی یک جہتی و یگانگت کا مظہر ہوتا ہے۔ بیان کریں۔

آپ بیتی

''آپ'' کے معنی ہیں خود اور ''بیتی'' سے مراد وہ حالات اور کیفیت جس سے گزرے ہوں۔ گویا آپ بیتی سے مراد کہانی، نیا حال اور خودنوشت حالات۔ یعنی کسی شخص کا اپنی سرگزشت زندگی اپنے قلم سے تحریر کرنا، آپ بیتی کہلاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے اوپر گزرے ہوئے حالات یا کیفیت زبانی بیان کرے تو وہ زبانی آپ بیتی کہلائے گی۔ امتحان کے دوران طلبہ کو کسی انسان کی آپ بیتی لکھنے کے لیے کم کہا جاتا ہے۔ البتہ بے جان چیزوں مثلاً کرسی، کتاب، گلاب کے پھول، گدھے، گھوڑے، کرایے کے مکان وغیرہ کی آپ بیتی لکھنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی بے جان یا بے زبان چیز تو اپنی آپ بیتی نہیں لکھ سکتی۔ لہٰذا آپ اپنے تخیل سے کام لیکر اِس بے جان یا بے زبان چیز کی آپ بیتی اپنے الفاظ میں تحریر کرتے ہیں۔ اور آپ بیتی لکھتے وقت اِن بے جان، بے زبان چیزوں کے حالات و واقعات اِن کی زبانی بیان کیے جاتے ہیں۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ طلبہ سے کسی بھی سفر کا آنکھوں دیکھا حال لکھوائیں۔
۲۔ کسی بھی فن پارے میں علم بیان یعنی تشبیہ، استعارے، مجاز مرسل، کنایہ وغیرہ کی شناخت کروائیں۔
۳۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا کوئی اور مضمون بھی کمرہ جماعت میں سنوایا جائے۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو جدید ادب میں صنفِ مضمون نگاری کی اہمیت بتادیں۔
۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے اسلوبِ تحریر سے روشناس کروائیں۔
۳۔ طلبہ کو سبق ''ریل کا سفر'' کی روشنی میں معاشرے میں سماجی یک جہتی اور یگانگت کی اہمیت سے روشناس کروائیں۔